© rasailojaraid.com

نہ اس غرض کے لیے روزمرہ کے معاملات میں بالعموم وہ یہ کام کیا کریں، بلکہ صرف اس غرض کے لیے کہ جب کسی دوسرے ذریعہ سے نتیجۂ مطلوب حاصل نہ ہو تو اس ذریعہ کو استعمال کیا جائے" (انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز جلد ۵)

اب ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ ہمارے ہاں اس آخری چارہ کار کے اختیار کرنے کی ضرورت امریکہ، اور دنیا کے ہر دوسرے ملک سے زیادہ ہے۔ جہاں کھلی کھلی دھاندلیوں اور جعلسازیوں اور زرپاشیوں سے کچھ لوگ زبردستی ایوانِ نمائندگان میں پہنچے ہوں، جہاں بڑے بڑے بااثر لوگ چور دروازوں سے پارلیمنٹ میں داخل ہوئے ہوں، جہاں سازشیں اور سودے بازیاں کرکے نہایت نازک اور اہم ملکی مسائل کے متعلق ایسے قوانین بنائے جاتے ہوں جن کا اصل مقصود بس چند لوگوں کو برسرِ اقتدار رکھنا ہو، اور جہاں حالت یہ ہو کہ ایک طرف سارا ملک چیخ رہا ہے اور دوسری طرف قانون سازی کے اجارہ دار اپنی من مانی کیے جا رہے ہیں، ایسی جگہ تو عوام کے لیے ان بددیانت قانون سازوں کی زیادتیوں سے نجات پانے کا یہ راستہ لازماً کھلنا چاہیے کہ جو قانون ان کی مرضی کے خلاف اور ان کے احتجاج کے علی الرغم بنایا گیا ہو اسے وہ ریفرنڈم کے ذریعہ سے بدل سکیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ جو لوگ جمہوریت پسندی کے دعوے کرتے ہیں وہ آخر کس منہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ناجائز ہتھکنڈوں سے برسرِ اقتدار آنے والے لوگ چند سال کے لیے ملک میں مختارِ کل بنا کر بٹھا دیئے جائیں اور وہ اپنی اغراض کے لیے خواہ کیسے ہی نارواقوانین بنا بیٹھیں، عوام کے پاس ان کے فیصلے بدلوانے کا کوئی اختیار نہ ہو۔

کیا اسلام کے سب اصول بے لچک ہیں؟

سوال: آپ نے ربیع الثانی ۱۳۷۶ھ (دسمبر ۱۹۵۶ء) کے ترجمان میں کسی صاحب کے دو مکتوبات کا جواب دیا ہے جن میں آپ نے لکھا ہے: "ہم اپنی تحریک کو خلا میں نہیں چلا رہے ہیں بلکہ واقعات کی دنیا میں چلا رہے ہیں۔ اگر ہمارا مقصد محض اعلانِ حق ہوتا تو ہم ضرور صرف بے لاگ حق بات کہنے پر اکتفا کرتے، لیکن ہمیں چونکہ حق کو قائم بھی کرنے کی کوشش کرنی ہے اور اس کے لیے اسی واقعات کی دنیا میں سے راستہ نکالنا ہے اس لیے ہمیں نظریت (آئیڈیلزم) اور حکمتِ عملی کے درمیان توازن برقرار رکھتے ہوئے چلنا پڑتا ہے"۔۔۔ "حکمتِ عملی ہی یہ طے کرتی ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے راستے کی کن چیزوں کو آگے پیش قدمی کا ذریعہ بنانا چاہیے، کن کن موانع سے فائدہ اٹھانا چاہیے، کن کن موانع کے ہٹانے کو مقدم اہمیت دینی چاہیے اور اپنے اصولوں میں سے کن میں بے لچک ہونا اور کن میں اہم تر مصالح کی خاطر حسبِ ضرورت لچک گنجائش نکالنی چاہیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آئیڈیلزم اور حکمتِ عملی کے درمیان توازن برقرار رکھنے اور بعض اہم تر مصالح یا دینی مقاصد کی خاطر بعض اصولوں میں لچک پیدا کرنے کی مثال آپ نے سنتِ نبویؐ سے یہ پیش کی ہے: "اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں ... لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آنحضورؐ نے ہدایت دی کہ الائمۃ من قریش (امام قریش میں سے ہوں)۔" اس استثناء کی توجیہ آپ نے یہ کی ہے کہ "اس وقت عرب کے حالات میں کسی غیر عرب تو درکنار کسی غیر قریشی خلیفہ کی خلافت بھی عملاً کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے حضورؐ نے خلافت کے معاملے میں مساوات کے اس عام اصول پر عمل کرنے سے صحابہ کو روک دیا کیونکہ اگر عرب ہی میں حضورؐ کے بعد اسلامی نظام درہم برہم ہو جاتا تو دنیا میں اقامتِ دین کے فریضہ کو کون انجام دیتا؟ یہ اس بات کی صریح مثال ہے کہ ایک اصول کو قائم کرنے پر ایسا اصرار جس سے اس اصول کی بہ نسبت بہت زیادہ اہم دینی مقاصد کو نقصان پہنچ جائے، حکمتِ عملی ہی نہیں حکمتِ دین کے بھی خلاف ہے۔" اس کے بعد آپ نے لکھا ہے "مگر یہ معاملہ اسلام کے سارے اصولوں کے بارے میں صحیح نہیں ہے۔ جن اصولوں پر دین کی اساس قائم ہے، مثلاً توحید اور رسالت وغیرہ، ان میں عملی مصالح کے لحاظ سے لچک پیدا کرنے کی کوئی مثال حضورؐ کی سیرت میں نہیں ملتی، نہ اس کا تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔"

بعض لوگوں نے آپ کے ایسے اقتباسات نقل کر کے ان سے بعض نتائج اخذ کیے ہیں اور پھر آپ پر بعض اعتراضات وارد کیے ہیں۔ مثلاً ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ "جو فکر و فلسفہ تحریکِ اقامتِ دین کے نام سے سید الرسلؐ کی جانب منسوب کیا جا رہا ہے، اس کا تجزیہ کیجیے تو صورتِ واقعہ یوں بنتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی نظام قائم کرنے کی تحریک جاری فرمائی اور اس کے چند اصول بیان فرمائے۔ ان میں سے بعض تو وہ تھے جن کا تعلق ایمانیات سے تھا، مثلاً ایمان باللہ، ایمان بالرسالت وغیرہ ... حضورؐ کی پوری زندگی میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی جس سے ان اصولوں میں لچک اور استثناء کا ثبوت پیش کیا جا سکے۔ لیکن ان کے ساتھ کچھ دوسری قسم کے اصول بھی آنحضورؐ نے پیش فرمائے۔ مثلاً جو اسلامی نظام میں قائم کروں گا اس میں ہر اسود و ابیض اور عربی و عجمی کا درجہ مساوی ہوگا، سب کو جان و مال اور عزت و آبرو کی آزادی حاصل ہوگی وغیرہ ... لوگوں نے ان اصولوں کو مفید محسوس کیا اور اپنی خدمات اسلامی نظام کے قیام کے لیے پیش کر دیں ... بالآخر وہ لمحہ آیا کہ یہ نظام عملاً قائم ہو۔ اس مرحلہ پر قائدِ تحریک محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طرزِ عمل اختیار فرمایا وہ یہ تھا کہ آپ نے اپنی تحریک کے آغاز میں لوگوں کے سامنے جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آئیڈیل پیش فرمایا تھا، اس کے ان اصولوں کو جو اول الذکر قسم (الٰہیات) کے اصولوں سے الگ تھے (مثلاً مساوات، شخصی آزادی، جان و مال کی حفاظت وغیرہ) ان کے بارے میں طے فرما دیا کہ ان میں سے جو اصول حکمتِ عملی سے متصادم ہونگے یعنی جن پر عمل پیرا ہونے سے اقامتِ دین کی تحریک کو نقصان پہنچے گا، ان میں استثناء اور لچک پیدا کر لی جائے گی۔"

مزید تحلیل و تجزیہ کرتے ہوئے آپ کا موقف یہ قرار دیا گیا ہے گویا کہ آپ نے اس اصول کو بطور فلسفہ و عقیدہ کے طے کر لیا ہے کہ اسلامی نظام کے دعوتی اور اشاعتی دور میں جو اصول بیان کیے جائیں اور جن پر لوگوں کو جمع کیا جائے، جب اسلامی نظام قائم کرنے کا وقت آئیگا تو اس تحریک کے قائد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ توحید و رسالت ایسے اساسی اصولوں کے سوا تحریک کے مفاد کے لیے جس اصول میں ضروری خیال کرے استثناء پیدا کر لے، اس پر عمل کرنے سے اپنی جماعت کو روک دے اور جو ضمانت اس تحریک نے عوام کو ابتدائی دور میں دی ہو، اس میں سے جس جزو کو وہ دین کی مصلحت کے لیے مضر خیال کرے، ساقط کر دے۔"

آپ کا یہ مسلک متعین کرنے کے بعد انہی مکتوبات سے آپ کا ایک دوسرا اقتباس بھی دیا گیا ہے جس میں آپ نے کہا ہے کہ "ہم اسلام کے موجد تو نہیں ہیں کہ اپنی مرضی سے جیسا چاہیں پروگرام بنائیں اور دعوتِ اسلامی کا معاد جس طریقہ میں ہم کو نظر آئے اس کو اختیار کر لیں۔" اس اقتباس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آپ کے بیان میں تضاد و تناقض ہے اور آپ کا رویہ ایک معمہ بن گیا ہے۔ پھر یہ حضرات اس معمے کو حل کرنے اور بقولِ خویش اس کے پس منظر میں آپ کے ذہن کی گہرائیوں کو پڑھنے کی بھی کوشش کرتے ہیں اور آخر کار یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ آپ پہلے کبھی اسلام کے ساتھ اخلاص کا معاملہ کرتے رہے ہوں تو کرتے رہے ہوں مگر پاکستانی سیاسیات میں حصہ لینے کے بعد آپ اسلام کو اپنے ذاتی اور جماعتی اغراض پر قربان کرنے کے درپے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف آپ مکمل اسلامی دستور کے مطالبے کی کامیابی سے مایوس ہیں مگر دوسری طرف مسندِ حکومت پر پہنچنے کے بھی متمنی ہیں، اس لیے اپنے اس اصول کو برقرار رکھنے کے لیے کہ "جس حکومت کا دستور ایسا اور ایسا نہ ہو اس میں حصہ نہیں لیا جا سکتا" آپ نے اصولوں میں لچک پیدا کرنے کا نظریہ پیش کر دیا ہے۔ اسی طرح آپ کی جداگانہ انتخاب کی حمایت کا سبب بھی یہی بیان کیا گیا ہے کہ مخلوط انتخاب میں آپ کا اور آپ کی جماعت کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اس وجہ سے آپ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاملہ میں اسلام کے اصولوں کا سہارا لیتے ہیں۔

جو لوگ حال ہی میں جماعت اسلامی سے الگ ہوئے ہیں ان کی علٰحدگی کی اصل بنیاد بھی یہی بیان کی گئی ہے کہ ان کے احساس کے مطابق بھی آپ کے سامنے اب مسئلہ صرف اقتدار حاصل کرنے کا ہے اور اس مقصد کے لیے آپ جس وقت جو پالیسی مناسب سمجھیں اختیار کرنے پر آمادہ ہیں چاہے وہ اسلام کے اصولوں کے کتنے ہی خلاف ہو نیز اگر ضرورت پڑے تو آپ اسلامی اصولوں کی من مانی تشریح کرنے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ ان لوگوں کے بقول آپ کی اسلامی تحریک اور ان طالع آزما سیاست دانوں کی تحریکات کے مابین کوئی فرق نہیں ہے جو حصول اقتدار سے پہلے نہایت پاکیزہ اصول بیان کرتے ہیں لیکن جب انہیں اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو وہ ان وعدوں اور اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور اسلام کے اصولوں میں وقتی مصالح کی بنا پر اپنی صوابدید کے مطابق ترمیم و تنسیخ جائز سمجھتے ہیں۔

بہرکیف اس طرح کی بحثیں اور اعتراضات چونکہ پیدا کیے جا رہے ہیں اور ان سے بکثرت لوگ غلط فہمیوں میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ اس لیے یہ بہت مناسب بلکہ ضروری ہے کہ آپ ایک مرتبہ اچھی طرح وضاحت کر دیں کہ آپ کی زیر بحث تحریروں کا صحیح مدعا کیا ہے اور جماعت کی پالیسی کے خلاف جو اعتراضات پھیلائے گئے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔

جواب: میری مذکورۂ بالا تحریروں پر جو حاشیہ آرائیاں کی گئی ہیں وہ سب میری نگاہ سے گزرتی رہی ہیں مگر میں نے اُن پر اسی طرح صبر کیا جس طرح اس سے پہلے بہت سے حضرات کے فتووں، اشتہاروں اور رسالوں پر صبر کرتا رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے جو تھوڑی سی مُہلتِ عمر اور قوتِ تحریر و تقریر مجھے عطا فرمائی ہے اس کو میں کسی مفید کام میں صرف کرنا چاہتا ہوں تاکہ دنیا میں اس سے خدا کے دین کی کچھ خدمت ہو جائے اور آخرت میں وہ میرے گناہوں کا کفارہ بن سکے۔ میرے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ اس فدا سے وقت اور اس تھوڑی سی قوت کو ایسی بحثوں میں ضائع کروں جن کا کوئی حاصل دنیا میں دین اور اہلِ دین کی رسوائی اور آخرت میں نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی باز پرس کے سوا کچھ نظر نہ آتا ہو۔ اس وقت بھی میرے پیش نظر اُن حاشیہ آرائیوں کا جواب دینا نہیں ہے جو میری ان تحریروں پر کی گئی ہیں بلکہ صرف اپنا مدعا واضح کرنا ہے، تاکہ اگر کوئی اللہ کا بندہ ان سے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا ہو تو اس کے دل کا وسوسہ دُور ہو جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان عبارتوں سے میرا مدعا جو کچھ ہے اسے سمجھنے کے لیے وہی ایک فقرہ کافی ہے جو خود ان نقل کردہ عبارتوں میں موجود ہے

"ایک اصول کو قائم کرنے پر ایسا اصرار جس سے اس اصول کی بہ نسبت بہت زیادہ اہم دینی مقاصد کو نقصان پہنچ جائے، حکمتِ عملی ہی نہیں حکمتِ دین کے بھی خلاف ہے۔"

اس فقرے پر جو شخص بھی تعصب اور نفسانیت سے بے لوث ہو کر غور کریگا وہ میرا مطلب سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ نظری حیثیت سے تو ہر صحیح اصول قائم کرنے کے لیے اور ہر غلط چیز ترک کرنے اور مٹا دینے کے لائق ہے، لیکن عملی زندگی میں خیر و شر کی کشمکش کے درمیان انسان کو بہت سے مواقع پر ایسے حالات سے بھی سابقہ پیش آجاتا ہے جن میں ایک چھوٹی بھلائی پر اصرار کرنے سے ایک بڑی بھلائی کا نقصان ہوتا ہے، یا ایک چھوٹی برائی ترک کرنے سے ایک بڑی برائی لازم آتی ہے۔ ایسے مواقع پر عقل بھی یہ چاہتی ہے کہ ایک کم قیمت چیز پر زیادہ قیمتی چیز کو قربان نہ کیا جائے، اور شریعتِ الٰہیہ میں جو حکمت معتبر ہے اس کا تقاضا بھی یہ ہے کہ بڑی برائی سے بچنے کے لیے چھوٹی برائی کو گوارا کیا جائے اور چھوٹی بھلائی کی خاطر بڑی بھلائی کو نقصان نہ پہنچنے دیا جائے۔ اس معاملے میں میں صرف عقل کو کسوٹی بنانے کا قائل نہیں ہوں کہ آدمی جب چاہے عملی ضروریات کی بنا پر اسلام کے اصول و قواعد اور احکام میں سے جس کی بندش سے چاہے نکل جائے، بلکہ یہ بات میرے اسی فقرے سے ظاہر ہے کہ میں اس حکمت کا قائل ہوں جو خود اسلام کے دیئے ہوئے معیار سے جانچ کر یہ دیکھتی ہے کہ کس چیز کی خاطر کس چیز کو کہاں اور کس حد تک قربان کرنا ناگزیر ہے۔

اب دیکھیے کہ آیا یہ کوئی میری اپنی من گھڑت بات ہے یا فی الواقع شریعت کے نظام میں اس کے اپنے سکھائے ہوئے اصول و قواعد اور احکام کے درمیان قیمتوں کا فرق ہے اور کوئی ایسا قاعدہ پایا جاتا ہے جس کے لحاظ سے کم قیمت چیز کو بڑی قیمت کی چیز پر قربان کرنا جائز ہو۔ اس کی مثالیں اگر قرآن، حدیث، آثارِ صحابہ اور فقہاء و محدثین کی تصریحات میں تلاش کی جائیں تو ان کا شمار مشکل ہوگا۔ میں یہاں صرف چند مثالیں پیش کرونگا۔

(۱) اسلام میں توحید کے اقرار کی جیسی کچھ اہمیت ہے کسی جاننے والے سے پوشیدہ نہیں۔ یہ حق پرستی کا اولین تقاضا اور ہر مومن سے دین کا سب سے پہلا مطالبہ ہے۔ نظری حیثیت سے دیکھا جائے تو اس معاملہ میں قطعاً کسی لچک کی گنجائش نہ ہونی چاہیے۔ ایک مومن کا کام یہ ہے کہ چاہے اس کے گلے پر چھری رکھ دی جائے اور خواہ اس کی بوٹیاں کاٹ ڈالی جائیں، وہ توحید کے اقرار و اعلان سے ہرگز نہ پھرے۔ مگر قرآن ایسے حالات میں جبکہ ایک شخص کو ظالموں سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جان کا خطرہ لاحق ہو جائے، یا ایسے ناقابلِ برداشت اذیّت دی جائے، کلمۂ کفر کہہ کر بچ جانے کی اجازت دیتا ہے بشرطیکہ وہ دل میں عقیدۂ توحید پر قائم رہے (مَنْ کَفَرَ بِاللّٰہِ مِنْ بَعْدِ اِیْمَانِہٖٓ اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَقَلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ النحل، رکوع ۱۴) - یہ چاہے عزیمت کا مقام نہ ہو، مگر رخصت کا مقام ضرور ہے، اور یہ رخصت اللہ تعالیٰ نے خود عطا فرمائی ہے - اس سے معلوم ہوتا کہ شریعت کی نگاہ میں مسلمان کی جان کی قیمت اقرارِ توحید سے زیادہ ہے، حتیٰ کہ اگر ان دونوں میں سے ایک کو قربان کرنا ناگزیر ہو جائے تو شریعت اقرارِ توحید کی قربانی گوارا کر سکتی ہے لیکن کیا جان بچانے کے لیے کفر کی تبلیغ بھی کی جا سکتی ہے؟ کسی دوسرے مسلمان کو قتل بھی کیا جا سکتا ہے؟ اسلامی حکومت کے خلاف جاسوسی کی خدمت بھی انجام دی جا سکتی ہے؟ اس کا جواب لازماً نفی میں ہے۔ کیونکہ یہ اپنی جان کی قربانی کی بہ نسبت بہت زیادہ قیمتی چیزوں کی قربانی ہوگی جس کی اجازت کسی حال میں نہیں دی جا سکتی۔

(۲) اسلام میں شراب، خنزیر، مردار، خون، اور مَا اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ کو اسی طرح قطعاً حرام کیا گیا ہے جس طرح زنا، چوری، ڈاکے اور قتل کو حرام کیا گیا ہے۔ لیکن اضطرار کی حالت پیدا ہو جائے تو جان بچانے کے لیے پہلی قسم کی حرمتوں میں شریعت رخصت کا دروازہ کھول دیتی ہے، کیونکہ ان حرمتوں کی قیمت جان سے کم ہے، مگر خواہ آدمی کے گلے پر چھری ہی کیوں نہ رکھ دی جائے، شریعت اس بات کی اجازت کبھی نہیں دیتی کہ آدمی کسی عورت کی عصمت پر ہاتھ ڈالے، یا کسی بے قصور انسان کو قتل کر دے۔ اسی طرح خواہ کیسی ہی اضطرار کی حالت طاری ہو جائے، شریعت دوسروں کے مال چرانے اور سرقہ یا ڈاکہ زنی کر کے پیٹ بھرنے کی رخصت نہیں دیتی کیونکہ یہ برائیاں اپنے نفس کو ہلاکت میں ڈالنے کی برائی سے شدید تر ہیں۔

(۳) راستبازی و صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ صلح بین الناس اور ازدواجی تعلقات کی درستی کے لیے اگر صرف صداقت کو چھپانے سے کام نہ چل سکتا ہو تو ضرورت کی حد تک جھوٹ سے بھی کام لینے کی شریعت نے صاف اجازت دی ہے۔ جنگ کی ضروریات کے لیے تو جھوٹ کی صرف اجازت ہی نہیں ہے بلکہ اگر کوئی سپاہی دشمن کے ہاتھ گرفتار ہو جائے اور دشمن اس سے اسلامی فوج کے راز معلوم کرنا چاہے تو ان کا بتانا گناہ اور دشمن کو جھوٹی اطلاع دے کر اپنی فوج کو بچانا واجب ہے۔ اسی طرح اگر کوئی ظالم کسی بے گناہ کے قتل کے درپے ہو اور وہ غریب کہیں چھپا ہوا ہو تو سچ بول کر اس کے چھپنے کی جگہ بتا دینا گناہ اور جھوٹ بول کر اس کی جان بچا لینا واجب ہے۔ اس معاملہ میں شریعت کے احکام ملاحظہ ہوں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عن ام کلثوم بنت عُقبة بن مُعیط قالت سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول لیس الکذاب الذی یصلح بین الناس فینمی خیرًا ویقول خیرًا (متفق علیہ) وفی روایة مسلم زیادة قالت ولم اسمعه یرخص فی شیءٍ مما یقوله الناس الا فی ثلث یعنی الحرب والاصلاح بین الناس وحدیث الرجل امرأته وحدیث المرأة زوجها۔

ام کلثوم بنت عُقبہ بن مُعیط سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلعم کو فرماتے سنا کہ وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو لوگوں کے درمیان صلح کراتا ہے اور اس غرض کے لیے خیر پہنچاتا اور خیر کہتا ہے (بخاری و مسلم)۔ اور مسلم کی روایت میں اتنی بات اور زیادہ ہے کہ انھوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی معاملہ میں وہ باتیں کرنے کی اجازت دیتے ہوئے نہیں سنا جو لوگ کیا کرتے ہیں، مگر تین معاملات اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ایک جنگ، دوسرا اصلاح بین الناس، تیسرے میاں اور بیوی کی باتیں۔

عن اسماء بنت یزید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا یحل الکذب الا فی ثلاث تحدث الرجل امرأته لیرضیها والکذب فی الحرب وفی الاصلاح بین الناس (ترمذی)

اسماء بنت یزید نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ جھوٹ جائز نہیں ہے مگر تین چیزوں میں۔ مرد کی بات عورت سے تاکہ وہ اس کو راضی کرے۔ جنگ اور اصلاح بین الناس۔

اس کی عملی مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں۔ کعب بن اشرف کے قتل کے لیے محمد بن مَسلَمہ کو جب حضورؐ نے مامور کیا تو انھوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں؟ حضورؐ نے بالفاظ صریح انہیں اس کی اجازت دی (بخاری، باب الکذب فی الحرب و باب الفتک باہل الحرب)۔ حجاج بن علاط نے غزوۂ خیبر کے موقع پر مکہ والوں کے قبضے سے اپنا مال نکال کر لانے کے لیے جھوٹ سے کام لینے کی اجازت مانگی اور حضورؐ نے ان کو بھی اس کی اجازت عطا فرمائی (احمد، نسائی، حاکم، ابن حبان)۔

ان نظائر کی بنا پر فقہاء و محدثین نے جو نتائج نکالے ہیں وہ بھی ملاحظہ فرما لیے جائیں۔ علامہ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

اتفقوا علی جواز الکذب عند الاضطرار کما لو قصد ظالم قتل رجل وهو مختفٍ عنده فله ان ینفی کونه عنده ویحلف علی ذلک ولا یأثم (فتح الباری۔ ج ۵۔ ص ۱۹۰)

علماء اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ شدید ضرورت پیش آنے پر جھوٹ بولنا جائز ہے۔ مثلاً اگر ایک ظالم کسی شخص کو قتل کرنا چاہتا ہو اور وہ مظلوم کسی شخص کے پاس چھپا ہوا ہو تو اس کو حق پہنچتا ہے کہ اپنے پاس اس کے ہونے کا انکار کرے اور اس پر قسم کھا لے۔ ایسا کرنے میں وہ گناہگار نہ ہوگا۔

علامہ ابن القیم حجاج بن علاط سُلَمی کا واقعہ نقل کرنے کے بعد اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ومنها جواز كذب الانسان على نفسه وعلى غيره اذا لم يتضمن ضرر ذالك الغير اذا كان يتوصل بالكذب الى حقه (زاد المعاد ۔ ج ۲ ص ۲۰۳)

اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ آدمی کا اپنے متعلق یا کسی دوسرے کے متعلق جھوٹ بولنا ایسی حالت میں جائز ہے جبکہ دوسرے کا اس سے کوئی نقصان نہ ہو اور آدمی اس جھوٹ کے ذریعہ سے اپنا ایک جائز حق حاصل کرے۔

علامہ نووی ریاض الصالحین میں احادیث سے استدلال کرتے ہوئے یہ اصول بیان کرتے ہیں:

کل مقصود محمود یمکن تحصیله لغیر الکذب یحرم الکذب فیه وان لم یمکن تحصیله الا بالکذب جاز الکذب ثم ان کان تحصیل ذالك المقصود مباحا کان الکذب مباحا وان کان واجبا کان الکذب واجبا۔ (باب تحریم الکذب)

ہر اچھا مقصد جس کا حصول جھوٹ کے بغیر ممکن ہو اس کے لیے جھوٹ بولنا حرام ہے لیکن اگر اس کا حصول جھوٹ کے بغیر ممکن نہ ہو تو جھوٹ جائز ہے۔ پھر اگر وہ مقصد ایسا ہو کہ اس کا حاصل کرنا مباح ہو تو اسکے لیے جھوٹ بھی مباح ہے اور اگر اس کا حصول واجب ہو تو اس کے لیے جھوٹ بھی واجب ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو یہاں بھی وہی قاعدہ کار فرما نظر آتا ہے کہ سچ بولنے اور جھوٹ سے اجتناب کرنے کی ایک اخلاقی قیمت ہے جس سے زیادہ قیمتی چیز کا نقصان ہو رہا ہو تو اس نسبۃً کم قیمت چیز کا نقصان گوارا کیا جا سکتا ہے، بلکہ بعض صورتوں میں گوارا کرنا چاہیے۔

(۴) غیبت کی حرمت اسلام میں جیسی کچھ شدید ہے وہ قرآن کے ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا (کیا تم میں سے کوئی شخص یہ پسند کریگا کہ اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھائے؟) لیکن کون نہیں جانتا کہ محدثین نے احادیث کی تحقیق کے لیے ہزارہا راویوں پر جرح کر ڈالی اور یہ سارا کام سراسر غیبت تھا۔ کیا اس کے لیے کوئی دلیل جواز اس کے سوا پیش کی جا سکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط باتوں کی نسبت اور دین میں حضورؐ کی سند سے ایسی باتوں کا رواج جو حضورؐ نے نہیں فرمائیں، غیبت کی بہ نسبت بہت بڑی برائی تھی، اس لیے اس بڑی برائی سے بچنے کے لیے اس چھوٹی برائی کو اختیار کرنا نہ صرف جائز بلکہ واجب تھا؟ اسی طرح اگر کوئی شریف آدمی کسی شخص کو بیٹی دے رہا ہو، یا کسی کے ساتھ شرکت کا معاملہ کر رہا ہو، اور آپ کو معلوم ہو کہ وہ شخص بداخلاق اور بدمعاملہ ہے، تو اس کی برائی بیان کرنا نہ صرف جائز بلکہ واجب ہے، کیونکہ ایک غریب لڑکی کی زندگی برباد ہونا، یا ایک شریف آدمی کا ایک بے ایمان آدمی کے پھندے میں پھنس جانا غیبت کی برائی سے زیادہ بڑی برائی ہے۔

(۵) غیر محرم عورت کو برہنہ کرنا اسلام کے صریح احکام کی رو سے قطعاً حرام ہے۔ لیکن فتح مکہ سے پہلے حضرت حاطب بن ابی بلتعہ نے جس عورت کے ذریعہ سے اہل مکہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادے کی اطلاع لکھ کر بھیجی تھی اسے حضرت علیؓ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

راستے میں گرفتار کرتے ہیں اور خط کی تلاشی کے لیے اس کے کپڑے اتارنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ ابن القیم نے اس سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ مصلحتِ اسلام و مسلمین کی خاطر تفتیش کی ضرورت پیش آئے تو عورت کو برہنہ کیا جا سکتا ہے (زاد المعاد ج ۲ ص ۲۳۹)

(۶) اسلام میں نماز کی اہمیت جیسی کچھ ہے، بیان کی حاجت نہیں۔ لیکن بخاری و مسلم کی متفق علیہ روایت ہے کہ بنی عمرو بن عوف کے ہاں ایک جھگڑے میں صلح کرانے کے لیے رسول اللہ صلعم تشریف لے گئے، نماز کا وقت آیا اور حضور اصلاح بین الناس کے کام میں مشغول رہے، آخر کار حضرت ابو بکر کی امامت میں جماعت کھڑی ہوگئی اور حضور بعد میں آکر جماعت میں شریک ہوئے

(۷) انکارِ منکر شریعتِ حقہ کے نہایت اہم واجبات میں سے ہے اور اس باب میں خدا اور رسول کے تاکیدی احکام کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ لیکن جب یہی چیز ایک منکر سے عظیم تر منکر رونما ہونے کی موجب ہوتی نظر آئے تو اس سے اجتناب واجب ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر فاسق و فاجر امراء کے خلاف خروج کرنے سے منع فرما دیا اور حکم دیا کہ من رأی من امیرہ ما یکرھہ فلیصبر ولا ینزعن یداً من طاعتہ۔

(۸) اسلام میں اقامتِ حدود کے لیے جیسے سخت تاکیدی احکام ہیں ان سے کون صاحبِ علم ناواقف ہے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے موقع پر چوروں کے ہاتھ کاٹنے سے منع فرما دیا (ابوداؤد) اور حضرت عمرؓ نے فرمان جاری کیا کہ جب کوئی فوج دشمن کے علاقے میں جنگ کر رہی ہو اس وقت وہاں کسی مسلمان پر حد جاری نہ کی جائے، کیونکہ اس سے اندیشہ تھا کہ کہیں کسی شخص پر حمیتِ جاہلیہ کا غلبہ نہ ہو جائے اور وہ دشمن سے نہ جا ملے (اعلام الموقعین جلد ۳ ص ۲۴-۲۹)۔ یہ معاملہ حالتِ جنگ تک ہی محدود نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعۂ افک میں تین مخلص مومنوں پر حدِ قذف جاری فرمائی مگر عبد اللہ بن ابی رئیس المنافقین کو چھوڑ دیا۔ ابن القیم اس کے وجوہ بیان کرتے ہوئے ایک وجہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ حضور نے اس پر حد جاری کرنے سے اجتناب ایک ایسی مصلحت کی بنا پر کیا جو اقامتِ حد کی بہ نسبت زیادہ اہم تھی، اور یہ وہی مصلحت تھی جس کی بنا پر حضور اس سے پہلے بھی اس کا نفاق کھل جانے اور اس کی بہت سی موجبِ قتل باتیں سننے کے باوجود اس کو سزا دینے سے اجتناب فرماتے رہے تھے۔ وہ مصلحت یہ تھی کہ یہ شخص اپنے قبیلے میں بااثر تھا، اس کی بات ان میں چلتی تھی۔ اندیشہ تھا کہ اس پر حد جاری کی گئی تو فتنہ برپا ہو جائیگا۔ اس لیے حضور نے اس کے قبیلے کی تالیفِ قلب کرنا پسند فرمایا اور یہ مناسب نہ سمجھا کہ اس پر حد جاری کر کے ان لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کر دیا جائے" (زاد المعاد ج ۲ ص ۱۶۱)

(۹) مالِ غنیمت میں تمام شرکائے جنگ کے حقوق یکساں ہیں اور وہ ان میں برابری کے ساتھ تقسیم ہونا چاہیے۔ اس معاملہ میں شریعت کے احکام بالکل واضح ہیں اور یہی انصاف کا تقاضا بھی ہے۔ لیکن غزوۂ اوطاس کے اموالِ غنیمت میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش اور دوسرے قبائل کے مؤلفۃ القلوب کو خوب دل کھول کر عطیے دیئے اور انصار کو کچھ نہ دیا۔ انصار نے اس کی سخت شکایت کی تو حضورؐ نے اپنے اس فعل کی مصلحت یہ بتائی کہ یہ لوگ تالیفِ قلب کے محتاج ہیں اس لیے یہ دولت دنیا ان میں لٹا دی گئی ہے، الا ترضون یا معشر الانصار ان یذھب الناس بالشاۃ والبعیر وترجعون برسول اللہ ﷺ الی رحالکم (اے گروہ انصار، کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم رسول اللہ کو لیکر اپنی اقامت گاہوں کی طرف پلٹو؟)

ان مثالوں سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ دین کے سارے اصول اور احکام اپنی قدر و قیمت اور اپنے وزن میں یکساں نہیں ہیں بلکہ ان کے درمیان مراتب کا فرق ہے، اور دین کا ہر قاعدہ بے لچک نہیں ہے بلکہ اس کے بہت سے قواعد میں لچک کی گنجائش ہے۔ اس باب میں اصولی ضابطہ یہ ہے کہ ایک چھوٹی نیکی سے اگر بڑا گناہ لازم آتا ہو تو اس کا ترک اولیٰ ہے، اور ایک چھوٹی برائی اگر کسی بڑی نیکی یا عظیم تر دینی مصلحت کے لیے ضروری ہو تو اسے اختیار کر لینا بہتر ہے، اور دو برائیوں میں سے کسی ایک میں مبتلا ہونا بہرحال ناگزیر ہو جائے تو نسبتاً کم تر درجے کی برائی کو قبول کر لینا چاہیے اس کے ساتھ انہی مثالوں سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ نظام شریعت میں قدروں کے درمیان فرقِ مراتب کا معیار کیا ہے، کس طرح کی چیزوں پر کس طرح کی چیزوں کو فوقیت دی گئی ہے، اور کونسی قدریں ایسی ہیں جن سے بالاتر قدر کوئی نہیں ہے کہ اس پر انہیں قربان کیا جا سکتا ہو۔ میں نے زیر بحث عبارتوں میں جو کچھ لکھا تھا اس کی بنیاد یہی کچھ تھی۔ اب جن لوگوں نے اپنی طرف سے کچھ معنی آفرینیاں کی ہیں اور انہیں میرا مسلک قرار دے کر مجھ پر طرح طرح کے گھناؤنے الزامات لگائے ہیں ان کی باتوں سے میں بری الذمہ ہوں، اپنی ان باتوں کے لیے وہ خود ہی اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہیں۔

رہی وہ بحث جو الائمۃ من قریش سے میرے استدلال پر کی گئی ہے تو اس کے متعلق میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ جو کچھ میں نے دسمبر ۵۶ء کے ترجمان القرآن میں بالاجمال لکھا ہے اسے اپریل ۴۶ء کے ترجمان القرآن میں بتفصیل لکھ چکا تھا، اور وہ میری کتاب رسائل و مسائل جلد اوّل کے صفحات میں بھی ستمبر ۵۱ء سے موجود تھا مگر اس میں سے وہ کیڑے کبھی برآمد نہ ہوئے تھے جو دسمبر ۵۶ء کے ترجمان کی مختصر عبارت سے یکایک برآمد ہونے شروع ہو گئے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اسے عالم السرائر والخفایا ہی بہتر جانتا ہے اور اسی کا جاننا کافی ہے۔ بہرحال یہ بات تو سب طالبانِ علم کو معلوم ہونی چاہیے کہ آیا اُن احادیث کی صحت سے انکار ہے جن کی بنا پر حضور کی وفات کے بعد آپ کی جانشینی کے لیے قریش کو ترجیح دی گئی تھی؟ اور کیا اس واقعہ سے انکار ہے کہ سقیفۂ بنی ساعدہ کے وقت سے لیکر صدیوں تک انہی احادیث کی بنا پر قریش کو خلافت کے لیے ترجیح دی جاتی رہی حتیٰ کہ ایک مدت دراز تک فقہائے اسلام قرشیت کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلافت کے لیے شرط سمجھتے رہے ؟ یا ان احادیث اور حقائق کی صحت تسلیم کرنے کے بعد وہ اعتراضات کیے گئے ہیں جو سائل نے اپنے سوال میں معترضین کے مضامین سے نقل کیے ہیں ؟ اگر پہلی بات ہے تو ان احادیث اور تاریخی واقعات پر ایک علمی تنقید ہونی چاہیے تاکہ ہم جیسے ناواقف لوگوں کے علم میں بھی کچھ اضافہ ہو جائے۔ اور اگر دوسری بات ہے تو پھر سوچ لینا چاہیے کہ ان اعتراضات کا ہدف دراصل کون ہے اور میری منہ میں یہ گندگی کے چھینٹے کس دامنِ پاک پر پھینکے جا رہے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک بات اور بھی قابلِ ذکر ہے۔ دراصل یہ بحث شروع اس طرح ہوئی تھی کہ جماعت اسلامی نے سنہ ۱۹۵۱ء کے انتخابات کے موقع پر ایک پالیسی کا اعلان کیا تھا اور وہ یہ تھی کہ امیدواری چونکہ اسلام میں ناجائز ہے اس لیے ہم نہ خود امیدوار بن کر کھڑے ہونگے نہ کسی امیدوار کو ووٹ دینگے۔ بعد میں تجربات سے ہم کو معلوم ہوا کہ ہم ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ ہر ضمنی اور عام انتخاب میں پورے ملک کی ہر نشست کے لیے اپنے معیارِ مطلوب کے مطابق موزوں آدمی کھڑے کر سکیں۔ اس حالت میں تین قسم کے آدمی بالعموم میدان میں آتے ہیں۔ ایک وہ جو سرے سے نظامِ اسلامی ہی کے مخالف ہیں اور پاکستان کو ایک لادینی ریاست بنا دینا چاہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو نظامِ اسلامی کی مخالفت تو نہیں کرتے مگر اس کی حمایت میں بھی مشکل ہی سے مخلص مانے جا سکتے ہیں اور اپنے اعمال کے لحاظ سے بھی ناقابلِ اعتماد ہیں۔ تیسرے وہ جن کے دامن بھی بداعمالیوں سے داغدار نہیں ہیں اور نظامِ اسلامی کے لیے جن کے اخلاص پر بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن امیدواری کی صفت ان سب میں پائی جاتی ہے، کیونکہ ہمارے ملک میں یہی طریقہ مدت سے رائج ہے اور یہاں کے علماء تک امیدوار بن کر کھڑے ہونے میں مضائقہ نہیں سمجھتے، بلکہ بکثرت علماء کو فقہی حیثیت سے بھی اس طرح کی امیدواری کے ناجائز ہونے میں کلام ہے۔ اب اگر ہم اس بات پر اصرار کریں کہ ان تینوں قسم کے امیدواروں کے ساتھ یکساں معاملہ کریں گے اور سب کے حق میں اپنے ووٹ استعمال کرنے سے مجتنب رہیں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم پہلی دو قسموں کے لوگوں کی کامیابی کے لیے راہ ہموار کر دینگے اور تیسری قسم کے لوگوں کے ساتھ نظامِ اسلامی کے قیام کی کوشش میں ہمارا تعاون بھی مشکل ہی سے برقرار رہ سکیگا۔ اس طرح ہم ایک نسبتۃً چھوٹے درجے کی اور ضمنی اصلاح (امیدواری کے عدمِ جواز) کی خاطر ایک بڑی چیز (پورے ملک میں نظامِ اسلامی کے قیام) کو نقصان پہنچانے کے مرتکب ہونگے، حالانکہ اسلامی نقطۂ نظر سے اصل مقصدی اہمیت امیدواری کے طریقے کی اصلاح کو نہیں بلکہ نظامِ اسلامی کے قیام کو حاصل ہے جس کے قائم ہو جانے کے بعد تمام دوسری اصلاحات کے ساتھ امیدواری کے طریقے کی بھی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اس

© rasailojaraid.com